شخصیات

فرمایا آپ کے اس امریکہ میں ہردیال بھی آئے تھے۔ ہردیال کا نام آپ نے کیونکر سنا ہوگا؟ ہندوستان کی تحریک آزادی کا روشن ستارہ، دہلی کا خوش باش اور متمول نوجوان، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فراغت کے بعد 1905ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور شعور مزید بیدار ہوا تو انہیں یقین ہوگیا کہ ہندوستان کے تمام مسائل کا اصل حل ''آزادی'' ہے۔ تعلیم کو چھوڑا اور لاہور واپس آکر آزادی کے متوالوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ جے این چٹرجی، دینا ناتھ ہردیال، مولانا برکت اللہ بھوپالی سب اس ہردیال کے مداح تھے۔ پارٹی کا اصل نصب العین انگریزوں کو مارنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کارکنوں کو بم بنانے اور بم مارنے کی تربیت دی۔ 1912ء میں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ پر دہلی میں قاتلانہ حملہ ہوا۔ بم پھینکا گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ کارروائی ہردیال ہی کے ایما پر کی گئی تھی۔

اس زمانے میں چوہدری رحمت علی صاحب مرحوم (جنہوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا تھا۔) نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو تیز تر کرنے کے لیے تحریک کا خفیہ مرکز واشنگٹن میں قائم کیا تھا اور ایک ہوٹل خرید لیا تھا۔ ہوٹل کیا تھا یہ سب انقلابی وہاں جمع ہوجایا کرتے تھے۔ ہردیال بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ پھر ایک اور انقلابی ''رام چندر'' بھی وہاں پہنچ گئے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم اس زمانے میں فرانس میں تھے۔ چوہدری رحمت علی، رام چندر اور ہردیال نے بہت اصرار کر کے مولانا برکت اللہ مرحوم کو اس ہوٹل میں

بلایااور یوں یہ انقلابی اکھٹے ہو گئے۔ برکلے یونیورسٹی بھی اس خفیہ تحریک کا ایک مرکز تھی۔ چنانچہ جب دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم کا حملہ ہوا تو ہردیال اس وقت برکلے ہی میں تھے۔ ہردیال کو 23 دسمبر کو یہ خبر ملی تو وہ برکلے میں خوشی سے ناچنے لگے۔ ہندوستانی خون کہاں سے نچلا بیٹھنے والا تھا۔ تمام نوجوان ہندو، مسلمان ان کے ساتھ ناچنے لگے اور آزادی، آزادی کے نعرے گونجنے لگے۔ ہردیال کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑا اور اس نے اس بمبار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک پمفلٹ (Yugantar Circular) لکھا۔ وہ دور ہی ایسا تھا خود ہمارے شہر راولپنڈی میں D.A.V کالج روڈ پر چند طلباء نے مل کر ایک بم ساز فیکٹری قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن بعض عاقبت اندیش بزرگوں نے نصیحت کی کہ یہ کام نہ کرو، اور وہ رک گئے۔

ہر دور میں حصول خیر کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اپنے گردوپیش کی دنیا دیکھ کر ہی تعین کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے دور میں سب سے مؤثر طریقہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ دن دکھائے جب انصاف پسند، پڑھی لکھی اور مجبوریوں سے ماورا قوم کو خود ان کی زبان اور ان کی فہم کی سطح کے مطابق ہم اسلام کو پیش کر سکیں تو یہ دعوت ان کے لیے ضرور بالضرور مؤثر ثابت ہو گی اور اگر وہ اسلام کو سمجھ لیں تو دنیا بہت سے مصائب سے نجات پا جائے گی۔ اس دور میں طاقت کا استعمال مسائل میں اضافہ کر رہا ہے، حل نہیں کر رہا۔

فرمایا

آپ کے اس امریکہ میں موہن سنگھ بھی تو آئے تھے، آپ نے کیوں ان کا

نام سنا ہوگا اور پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہو، اس کا تو سوال ہی نہیں۔ وہ یہاں لکڑی کے کارخانے میں ایک ملازم تھے لیکن آزادی کی دھن ایسی تھی کہ کیلیفورنیا میں ایک جلسہ رکھ لیا۔ ہر دیال نے صدارت کی اور مولانا برکت اللہ بھوپالی تو شمع محفل تھے۔ انہوں نے ایک پارٹی بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور اسی سال جب سیکرومنٹو میں مزدوروں کے سنٹر میں جلسہ ہوا تو **.I.A.P.C** کے نام سے پارٹی تشکیل پائی۔ اس مخفف کی اصل ہے: **Indian Association of Pacific Coast** پارٹی تو بن گئی، اب کام کے لیے رقم درکار تھی۔ چنانچہ اسکی اپیل کی گئی تو اس وقت 1913ء میں ہندوستان کی آزادی کے لیے اسی جلسے میں لوگوں نے دس ہزار ڈالر سے زیادہ رقم جمع کرادی۔

موہن سنگھ، ہرمن سنگھ، کرتار سنگھ، پنڈت جگت رام، ہرنادی، پانڈورنگ کھان کھوجی اور مولانا برکت اللہ بھوپالی یہ سب اس پارٹی کے لیڈر تھے۔ وڈ سٹریٹ نمبر 5 سان فرانسسکو (Wood Street No.5, San Fransisco) کے ایک مکان میں دفتر بنا اور اردو، گورمکھی اور ہندی تینوں زبانوں میں پارٹی کا ترجمان اخبار ''غدر'' نکلنا شروع ہوا۔ ''غدر'' کے اڈیٹر ہر دیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی تھے۔ ''غدر'' دیکھتے ہی دیکھتے اپنے دور کا سب سے مقبول اخبار بن گیا۔ کتب، رسائل اور اخبارات تو گن کر فروخت ہوتے ہیں مگر ''غدر'' ایسا نکلا کہ ٹنوں کے حساب سے تول کر مختلف ممالک میں بھیجا جاتا تھا۔ وی۔ڈی۔ساورکر کی کتاب **(The Indian War of Independence)** کا اردو ترجمہ ''غدر'' میں بالاقساط چھپنے لگا اور اخبار کی مقبولیت

کا عالم یہ تھا کہ آپ کے اس امریکہ کے علاوہ، آسٹریلیا اور یورپ میں اسکی مانگ پوری کرنا دشوار تھی۔

اس دور میں جرمنی بھی برطانوی امپیرلزم کے خلاف تھا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ ہندوستانی جو جرمنی میں رہتے تھے، انہوں نے تو مالی طور پر اس پارٹی سے بہت تعاون کیا۔ امریکہ میں جرمنی سفیر نے بھی مالی تعاون کیا۔ اخبار نے ہزاروں نوجوانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی اور یہاں تک لوگوں نے اپنی ملازمتیں چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا کہ آزادی حاصل کریں۔ جاپان اور چین سے لوگ واپس آنے لگے اور حکومت ہند نے ان تمام آنے والوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ کرتار سنگھ، سیوا سنگھ، بیر سنگھ، سر یال سنگھ اور کیا کیا خوبصورت پنجابی سکھ نوجوان اور کس قدو کاٹھ کے گبرو تھے کہ اپنے وطن کی محبت میں اپنے گھر جانے کی بجائے، جیلوں میں جانے سے زیادہ خوش اور فخر محسوس کرتے تھے۔ ان میں سے سردار کرتار سنگھ جسکی عمر صرف 18 تھی، انگریزوں نے پھانسی چڑھا دیا تھا اور بقیہ لوگوں کو بھی شدید سزائیں دیں۔ جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں اگر آپ ہریش کے پوری کی کتاب **GADAR MOVEMENT, IDEOLOGY, ORGANIZATION AND STRATEGY.** پڑھیں تو آپ کو علم ہو کہ آزادی کے لیے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں نے کیا کیا قربانیاں دیں۔ لیکن اب اس آزادی کے بعد غلامی کا دور یاد آتا ہے کہ کم سے کم اس دور میں جتنا انصاف تھا، وہ آج کے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے انصاف سے بڑھ کر ہی تھا۔ معاشی ترقی بھی اس دور میں زیادہ تھی اور نظم و

ضبط بھی آج سے پہلے، اس غلامی کے معاشرے میں زیادہ پایا جاتا تھا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی 1927 میں بھی یہاں آئے تھے۔ اس سفر کے لیے انہوں نے جرمن فارن آفس سے ۱۰۰۰ مارک لے کر راجہ مہندر پرتاب —— جو کہ اس وقت عالمی سطح کے ہندوستانی لیڈر تھے —— کو دیئے تھے۔ اور پھر ڈیٹرائٹ (DETROIT) بھی تشریف لائے تھے۔ شکاگو بھی گئے تھے۔ پھر وہ آخر پر کیلی فورنیا چلے گئے تھے۔ ''غدر'' کے دفتر سے انہیں بہت محبت تھی۔ اس دفتر سے ہزاروں آدمیوں کو آزادی کی جدوجہد کے لیے آمادہ کیا گیا تھا۔ دفتر پہنچے تو شوگر کی وجہ سے بہت بیمار تھے۔ ہندو، مسلمان اور سکھ سب ہندوستانی جمع ہوئے۔ پرتپاک استقبال ہوا۔ مولانا یہ سب کچھ دیکھ کر رو پڑے اور لوگوں پر بھی ان آنسوؤں کا بہت اثر ہوا۔ فضا سوگوار ہوگئی اور پھر مولانا برکت اللہ صاحب نے تقریر کی۔ مولانا کی شوگر بہت بڑھ گئی اور پھر ستمبر 1927ء میں یہیں سیکرامنٹو ہی میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ میٹرو ویل میں ان کی قبر بنی تھی۔ آپ لوگ تلاش کریں تو مل ہی جائے گی۔ وہاں جانا چاہیے، فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ ہم ہندوستانی ہوں یا پاکستانی، مولانا برکت اللہ بھوپالی نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی۔ ان کا ہم سب پر احسان ہے۔ رحمہ اللّٰہ و طاب ثراہ.

فرمایا مولوی ذکاءاللہ مرحوم نے ہندوستان کی ایک بہت ضخیم تاریخ لکھی ہے، ریاضی اور سائنس کی کتابیں بھی سرسید احمد خان کی فرمائش پر لکھی تھیں اور یہ سرسید مرحوم کے دست راست تھے۔ اینڈریوز دہلی میں بہت باوجاہت انگریز افسر تھے، انہوں نے مولوی ذکاءاللہ

صاحب مرحوم پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام تھا ''ذکاء اللہ آف دہلی'' اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوکر، چھپ بھی گیا تھا لیکن اب نہ اصل کتاب ملتی ہے اور نہ اس کا ترجمہ۔ پڑھنے کی حسرت ہی ہے۔

مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی زندگی میں جو امور قابل تقلید تھے ان میں سے ایک کام ضبط اوقات بھی تھا۔ وقت کی پابندی مولوی صاحب مرحوم کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ یہ اور سر سید احمد خان صاحب کے صاحبزادے سید حامد گہرے دوست تھے۔ مولوی صاحب جس مکان میں رہتے تھے، اس میں ایک مرتبہ مرمت کی ضرورت پیش آئی تو اس مکان میں دن بھر تو مستری اور مزدور کام کرتے تھے اور رات کو مولوی صاحب شب بسری کے لیے تشریف لاتے تھے۔ پھر صبح ہوتے ہی وہ اپنے دوسرے مکان پر ناشتے کے لیے تشریف لے جاتے اور بقیہ وقت وہیں گذارتے۔ ایک مرتبہ جو صبح اپنے گھر سے نکلے اور دوسرے گھر جارہے تھے تو عجیب منظر یہ دیکھا کہ سید حامد ہاتھ میں دستی گھڑی لیے کھڑے ہیں، مولوی صاحب ان کی یہ ہیئت دیکھ کر ہنس پڑے اور پوچھا ''سید حامد خیریت ہے، کیا کر رہے ہو'' وہ بولے ''کہ رات گھڑی کو چابی نہ دینے کی وجہ سے یہ بند ہوگئی اور وقت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ چونکہ آپ کی چہل قدمی کا وقت معلوم تھا اس لیے آپ سے گھڑی کا وقت ملانے کھڑا ہوں''۔ مولوی ذکاء اللہ مرحوم ہنس پڑے اور فرمایا ''اچھا تو آپ مجھے گھڑی کے طور پر استعمال کر رہے ہیں''۔ دونوں دوست کھلکھلا کے ہنس دیئے اور دونوں چل پڑے۔

مولوی صاحب کی ''تاریخ ہند'' اپنے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

فرمایا علامہ شبلی نعمانی کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوا اور علامہ الطاف حسین حالی مرحوم کا انتقال دسمبر ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ان دونوں مرحومین کے انتقال پر گویا ایک صدی پورا ہوا ہی چاہتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ۱۹۰۹ء میں دہلی، خواجہ حسن نظامی مرحوم کو خط لکھا کہ کام کی زیادتی نے تھکا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں پر کامل سکون ملے۔ خواجہ صاحب نے لکھا کہ دہلی میرے پاس آجائیے اور رہیے، مکمل سکون ہوگا۔

چناچہ علامہ شبلی مرحوم چلے گئے۔ اور ایک مہینہ تک نواب بڈھن کی محل سرائے واقع چتلی قبر میں ٹھہرائے گئے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایک مہینہ تک کسی کو وہاں پھڑ کنے نہیں دیا۔ اسی ایک مہینے میں جناب خواجہ حسن نظامی مرحوم کی اہلیہ اور ایک بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ خواجہ صاحب مرحوم ان حوادث کا زیادہ اثر تو لیتے نہیں تھے اس لیے اپنے کاموں میں مصروف رہے اور جنازے بھی پڑھ دیئے۔

علامہ شبلی مرحوم یہ سب کچھ دیکھتے، سنتے رہے۔ پھر فرمایا:

''خواجہ صاحب جب میری بیوی کا انتقال ہوا تھا، تو میں تو اس کی جدائی میں پاگل ہی ہوگیا تھا، لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے کاموں میں مصروف ہیں، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ ارے بھئی آپ تو بہت مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔''

پورا مہینہ علامہ شبلی مرحوم نے، خواجہ حسن نظامی مرحوم کی پرزور سفارش پر، صرف ایک شخص کی دعوت قبول کی اور وہ تھے لالہ چندو لال چاول والے۔ لالہ جی بہت باذوق آدمی تھے اور اس زمانے میں دہلی سے ایک رسالہ ''زبان'' نکالا کرتے تھے۔ انہوں نے دعوت میں

بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ طرح طرح کے سالن اور چاول پکوائے اور علامہ شبلی نعمانی جب زردہ کھانے لگے تو لالہ جی نے ایک نوکر سے کہا ''ذرا گرم زردہ لانا''۔ دعوت ختم ہوئی اور علامہ شبلی مرحوم نے خواجہ حسن نظامی مرحوم سے لالہ چندو لال کی وضعداری اور مہمان نوازی کی از حد تعریف کی اور پھر فرمایا: ''مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ دہلی والے ہوکر لالہ جی نے ''گرم زردہ'' کے الفاظ کیوں استعمال کیے؟ گرم کا لفظ تو بریانی کے لیے بولا جاتا ہے''۔

فرمایا یہاں بہت سے لوگوں سے یہ سنا کہ قرآن کریم کا پہلا انگلش ترجمہ جناب محمد مارماڈیوک پکتھال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ یہ اطلاع قلت علم کا نتیجہ ہے۔ ان سے پہلے پامر(**palmer**) راڈویل(**Rodwell**) اور جارج سیل(**George Sale**) وغیرہ کے ترجمے شائع ہو چکے تھے۔ پکتھال بنیادی طور پر انگلش زبان کے عالمی شہرت یافتہ ادیب تھے۔ ترکی میں ۱۹۰۸ء میں جو انقلاب آیا تھا۔ انھوں نے اس پر ایک کتاب (**The early hours**) لکھی تھی۔ ایک اور کتاب، جس پر انھیں فخر تھا اور اس میں اسلام کے خلاف بہت کچھ مواد تھا اور وہ انھوں نے اپنے زمانۂ کفر میں لکھی تھی (**Saeed the fisherman**) تھی۔ پڑھنے لکھنے کے رسیا تھے اور ان کی اس عادت اور زور مطالعہ نے انھیں اسلام سے روشناس کرایا تھا اور پھر وہ نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ حضرت نظام حیدرآباد کی سرپرستی اور مالی تعاون سے وہ جامعۃ الازہر مصر گئے اور دو سال کی شبانہ روز محنت سے قرآن کریم کا ترجمہ بھی مکمل کیا۔ انہوں نے لندن میں اپنے قبول اسلام کا جب اعلان کیا تو اس کا بہت اچھا اثر یورپ پر پڑا۔ علمی حلقوں

کے بہت پڑھے لکھے انگریز کہنے لگے کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا آدمی قبول کر رہا ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبیاں تو ہوں گی جنہوں نے پکتھال کو متاثر کیا ہے۔ان کی بہت خواہش تھی کہ ان کی قبر سپین میں بنے لیکن مٹی لندن کی تھی ۱۹۳۶ء میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔

فرمایا

حکیم عبدالوہاب انصاری جنھیں عام طور پر حکیم نابینا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اپنے دور کے طبیب حاذق تھے۔مہاراج سرکشن پرشاد کے ہاں خواتین اور بچے بیمار ہو گئے تو مہاراجہ نے انھیں اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ یہ تشریف لے گئے تو سب سے پہلے بچے ملاحظہ کے لیے پیش کیے گئے۔ یہ نابینا تھے، ہر بچے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری تشخیص کر کے دوا لکھواتے رہے۔اب عورتوں کی باری آئی تو مہارانی صاحبہ کو آنے میں دیر ہوئی، تو جلدی سے مہاراج سرکشن پرشاد کرسی پر بیٹھے اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔حکیم صاحب نے خاموشی سے نبض پر ہاتھ رکھا اور پھر اٹھالیا۔مسکرا کر فرمانے لگے یہ نبض تو مہاراج کی ہے۔مہاراج حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔فرمانے لگے میں نے زندگی میں ایسا باکمال طبیب نہیں دیکھا۔ یہ سب حیدرآباد دکن کا قصہ ہے۔ ریاست میں ایسے ایسے باکمال لوگ تھے۔حکیم نابینا مرحوم نے علامہ اقبال کا علاج بھی کیا تھا۔ وہ جب شفایاب ہوئے تو حضرت حکیم نابینا صاحب مرحوم سے اتنے خوش تھے کہ ان کی شان میں ایک رباعی کہی جس میں ان کی اور انہوں نے جو دوا لاہور بھجوائی تھی ''روح الذہب'' دونوں کی تعریف کی۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی میرا
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا ذوق طلب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبح ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

فرمایا گاندھی جی یقیناً ہندوستان اور عالمی سطح کے بہت بلند پایہ رہنما تھے لیکن جدوجہد آزادی میں، ان کا ساتھ صرف ہندوؤں نے ہی نہیں مسلمانوں نے بھی بہت دیا تھا۔ مسلمانوں نے ان کے لیے بہت قربانیاں بھی دیں اور ان کی تمام تحریکیں—جو انگریزوں کے خلاف اٹھیں—مسلمانوں ہی کے تعاون سے، اپنے انجام کو پہنچیں۔ ایک مرتبہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے لیے کچھ رقم درکار تھی تو ایک میمن متمول تاجر جناب عمر سوبانی نے اکیلے انھیں صرف بمبئی ہی سے ۳۷ لاکھ جمع کر کے دیئے تھے اور گاندھی جی کا ٹارگٹ ایک کروڑ روپے کا تھا۔

عمر سوبانی یوسف سوبانی کے بیٹے تھے اور میمن برادری کے نہایت متمول تجار میں شمار کیے جاتے تھے۔ مشہور زمانہ مصوّروں کی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر خریدنے کے بہت شوقین تھے۔ منہ مانگی قیمت دے کر تصویر خریدتے تھے۔

وسیع المشرب طبیعت تھی۔ ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کو مدد کی ضرورت تھی تو مسٹر جناح کی مدد کی اور جب گاندھی جی نے ایک موقع پر امداد کی درخواست کی تو عمر سوبانی نے چیک بک کھول کر رکھ دی اور کہا ''گاندھی جی چیک بھر دیجئے'' گاندھی جی نے قلم اٹھایا اور

ایک لاکھ کا چیک بھر دیا۔ یہ دیکھ کر عمر سوبانی بہت ہنسے اور فرمانے لگے ''میں بہت سستا چُھوٹا'' گاندھی جی نے فرمایا ''بس یہ رقم کافی ہے'' یہ واقعہ ۱۹۲۶ء سے بھی پہلے کا ہے کیونکہ عمر سوبانی ۶ جولائی ۱۹۲۶ء کو رحلت فرما گئے تھے۔

ایسے کتنے ہی واقعات ملیں گے جن سے علم ہوگا کہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں بھی کسی سے کم نہیں۔

فرمایا یزید کے فسق و فجور میں کوئی شبہ ہونا تو درکنار اس کی تو تکفیر پر بحث ہے۔ احناف میں علمائے سمرقند و بخاریٰ کا بھی اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس کے کفر کا قائل ہے اور دوسرا اس کے فسق کا۔ اس کے دور میں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کی حکومت میں مزاحم ہو سکتے تھے، تین تھے: ایک تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان کی شفقت، حمایت اور ہمدردی تو سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھی لیکن وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اختلافی امور سے الگ رکھ کے اللہ تعالیٰ کی عبادت، اجتماعی فلاح اور فکر آخرت میں رہے۔

دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تھے اور وہ یزید کی فوج تو کیا، حجاج بن یوسف اور اس کے دستوں کے ساتھ بھی نبرد آزما رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں رتبہ شہادت پر فائز فرمایا۔ اور تیسرے یہ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما تھے جنھوں نے آخری دم تک اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یزیدیوں کو یہ لاج بھی لاحق نہ ہوئی کہ وہ بیٹا کس کا تھا؟ حضرت صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے کس محنت و مشقت سے اپنے لاڈلے کو پالا تھا اور پھر نواسہ ان کا تھا، جنھوں نے فرمایا تھا حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں۔ صلوٰت اللّٰہ و سلامہ علیھم اجمعین.

فرمایا یہ بات بھی یادرکھنے کے قابل ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اس قدر عبادت گذار تھا کہ ۱۷۹ھ کا رمضان آیا تو اس نے عمرے کا احرام باندھا اور پھر اسی احرام میں حج کی نیت کر لی اور پھر ایام حج میں بیت اللہ سے پیدل نکلا منٰی، عرفات، مزدلفہ اور پھر منٰی واپس پہنچ کر ذبح کے بعد احرام اتارا۔ ڈھائی ماہ تک احرام کی پابندیاں اور اطاعت الٰہی اب کس کو میسر ہے۔

علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم سے اسے اتنی عقیدت تھی کہ جب حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر پہنچی تو باقاعدہ غم کا اظہار کیا اور اعیان سلطنت نے اس غم کی تعریف کی۔ اس کے زمانے ہی میں حضرت ابو معاویہ نابینا رحمۃ اللہ علیہ بہت صاحب علم، اس کی ایک دعوت میں آئے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی باری آئی تو اس نے آفتابہ اٹھایا اور ہاتھ دھلاتے ہوئے دریافت کیا آپ اپنے نابینا ہونے کے سبب بینائی سے محروم ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ کون دھلا رہا ہے۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو ہارون الرشید نے اپنا تعارف کراتے ہوئے عرض کیا حضرت علم بہرحال قابل احترام ہے۔

فرمایا بنو امیہ میں حجاج بن یوسف اور بنو عباس میں عبدالرحمٰن بن مسلم خراسانی —— جو کہ تاریخ میں ابو مسلم خراسانی کے نام سے مشہور ہے —— دونوں اتنے بڑے سفاک (Bloodshedders) تھے کہ کون فیصلہ کر سکتا ہے کس نے، کس سے بڑھ کر خون بہایا دونوں، مسلمانوں کا خون بہانے میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ بلاوجہ محض اپنی

حکومتوں کے استحکام کے لیے مسلمان رعایا کی گردنیں کاٹتے اور معصوم خون سے اپنے دامن کو تر کرتے رہے۔

یہ ابو مسلم خراسانی پہلا شخص تھا جس نے بنو عباس کی حکومت میں سیاہ لباس کو سرکاری لباس قرار دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک عید یا جمعہ کے دن سیاہ عبا اوڑھ کر خطبہ دینا مستحب قرار پایا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس استحباب کی تصریح کی ہے۔

یہ ابو مسلم ایک مرتبہ سیاہ لباس اوڑھے خطبہ دے رہا تھا تو ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا کہ آپ نے سیاہ لباس کیوں زیب تن کر رکھا ہے؟ کہنے لگا میرے استاد حضرت ابو الزبیر نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنے سر مبارک پر سیاہ عمامہ باندھا تھا۔ اور سیاہ لباس ہمارا قومی لباس بھی ہے اور رعایا کو مرعوب کرنے کے کام بھی آتا ہے۔

پھر ایک فوجی کو اشارہ کیا کہ اس سوال پوچھنے والے کو اٹھاؤ اور اس کی گردن اڑا دو۔

چنانچہ وہ آدمی قتل کر دیا گیا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوگئی کہ اپنے حکمرانوں کے کاموں کا جواز دریافت کرتے پھرو۔

فرمایا ملا صدرا کا تعلق اگرچہ اہل تشیع سے تھا مگر اپنے فنون میں کمال کے انسان تھے۔ ان کی کتابیں اہل السنۃ کے مدارس میں بھی ایک عرصہ تک پڑھی اور پڑھائی جاتی رہیں لیکن اب تو درس نظامی کا صرف ڈھانچہ ہی رہ گیا، وہ لوگ جو فلسفہ اور منطق پڑھ کر علم کے مرد میدان تھے، شہروں کے شہر ان سے خالی ہوگئے اور ذات وصفات الٰہیہ کی مباحث

جاننے والے، علوم شرعیہ کے حاملین چل بسے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جب ملا صدرا کی کتابیں پڑھیں تو آنکھیں روشن ہوگئیں اور بعض مقامات تو ایسے ہیں کہ واہ، سبحان اللہ کیا کہنے۔ ۱۰۵۰ء میں وفات پائی اور اس دور میں سات حج کیے تھے۔ شیخ بہاؤالدین عاملی کے شاگرد تھے۔ ضروری علوم سے فراغت کے بعد پندرہ سال تک عبادت میں مصروف رہے۔ مخلوق سے انقطاع اور مراقبات میں مشغول رہے۔ اس کے بعد تحریر وتسوید کا کام ہوا۔ پندرہ کتابیں تو صرف تفسیر قرآن پر ہی لکھ دیں۔ موت کے بعد مسخ روح ہوتا ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر بہت عمدہ لکھا۔ اسرار الآیات میں بھی اس موضوع کو بیان کیا ہے۔ ہمارے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جس شخص پر جس خواہش نفس کا غلبہ ہوگا، حشر میں اسی صورت میں محشور ہوگا۔ کتنے ہی لالچی انسان کتوں کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ کتنے ہی بے حیا انسانی شکل میں جیتے رہے اور آخرت میں سور کی شکل میں محشور ہوں گے۔ بندروں تک کی صورت میں ہوں گے۔ ملا صدرا نے یہ مضمون اپنی کئی کتابوں میں نہایت شرح کے ساتھ مدلل بیان کیا ہے۔

فرمایا فلسفہ کے کچھ اسباق وتشریحات کراچی میں مولانا حکیم محمود احمد برکاتی مرحوم ومغفور سے پڑھے۔ ان کے پردادا مولانا حکیم دائم علی صاحب مرحوم بہار کے رہنے والے تھے اور جب شہرت ہوئی تو نواب ریاست ٹونک نے انھیں اپنا شاہی طبیب مقرر کرلیا تھا۔ پھر ان کے دادا نے اپنے والد مرحوم سے زیادہ شہرت پائی۔

مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی تو اپنے دور میں فلسفہ اور معقولات کے امام ہوئے۔ پھر ان

کے والد مرحوم نے اپنی زندگی طب کی خدمت میں بسر کی اور اب حضرت حکیم محمود احمد برکاتی صاحب مرحوم نے پوری ذمہ داری اور بساط بھر تحقیق کے ساتھ چند ایک کتابیں بہت عمدہ تحریر فرمائیں۔ خیرآبادی سلسلہ کی انتہا یہ ہوئی — فلسفہ ومعقولات کا جلال جاتا رہا— مولانا مودودی صاحب مرحوم نے بھی فلسفہ ومنطق اسی علمی خانوادے سے پڑھا تھا اور اس خاندان کے جس جس فرد سے واسطہ پڑا مجسمۂ متانت وصدق تھا۔

فرمایا

امام ابوبکر خصاف الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب النفقات'' کی ایک عمدہ شرح حضرت صدرالشہید حسام الدین ابومحمد عمر بن عبدالعزیز ابن مازہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۵۳۶ھ کی ہے۔ یہ شرح حضرت الشیخ ابوالوفاء افغانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے ساتھ چھپ گئی ہے اور ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔ حضرت صدرالشہید ابن مازہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں، علم کے میدان میں، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک تھے۔ لیکن افسوس کہ عمر بہت کم پائی۔ صرف ترپن سال جیے اور سمرقند میں ایک کافر نے انھیں شہید کردیا۔ جسد مبارک بخاریٰ منتقل کیا گیا۔ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں سے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے معجم میں اپنے مشائخ کے تذکرے میں ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور فقہ ان سے پڑھی تھی۔ اپنے والد حضرت برہان الدین الکبیر عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد تھے۔ علماء سمرقند، بخاریٰ، خراسان اور ماوراء النہر میں یہ ''بنو مازہ'' کا خاندان نہایت بلند پایہ علمی وقعت ووجاہت کا حامل تھا۔ حنفی فقہ کے آئمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم اس خاندان

کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا، اپنے لیے فخر وسعادت جانتے تھے۔ اس بنو مازہ کے خاندان میں کتنے ہی آئمہ ایسے گذرے ہیں جو صدر الشہید، صدر السعید اور برہان الائمہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ خود، ان کے والد عبدالعزیز، ان کے دادا عمر بن مازہ، ان کے بھتیجے محمود صاحب محیط، ان کے بیٹے ابو جعفر محمد بن عمر، حضرت صدر جہان محمد بن احمد بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ، یہ سب اسی خاندان ''بنو مازہ'' کے درخشندہ ستارے تھے۔ سلطان وقت سنجر بن ملک سلجوقی نے ان سب حضرات کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ رحمهم الله تعالیٰ جميعاً و حشرنا معهم.

فرمایا

ہمارے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور مستشرق جوزف ہوروٹس (Josef Horovitz) کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر بہت برہم ہوتے تھے۔ ان کے زمانے میں معارف میں ان کے کئی مضامین اس موضوع پر چھپے۔ پڑھنے اور سر دھننے سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ یہ پہلا مستشرق ہے جس نے ''الطبقات الکبریٰ لابن سعد رحمۃ اللہ علیہ'' جیسی سیرت طیبہ کی بنیادی مآخذ کتاب مرتب کرکے ہالینڈ کی لائڈن یونی ورسٹی سے اس کی دو جلدیں 1904ء سے لے کر 1918ء تک محنت کرکے دنیائے اسلام کو دیں۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو حسرت رہی کہ کاش وہ طبقات ابن سعد دیکھ لیتے لیکن ان کی وفات کے چار سال بعد ۱۹۱۸ء میں یہ کتاب چھپی۔ اس عظیم کام پر اسے ایک اور مستشرق ایڈورڈ زخاؤ (Eduard Sachau) نے راغب کیا تھا،

طبقات کے علاوہ اس نے ابن قتیبہ کی کتاب ''عیون الاخبار'' کا انگلش ترجمہ بھی کیا۔ افسوس کہ عمر زیادہ نہ پائی صرف 57 سال جیا اور 5 فروری 1931ء میں انتقال ہوا۔

فرمایا ابن حزم ظاہری کی کتابیں پڑھیں تو یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ احادیث و آثار سے آگاہی ہوئی لیکن بعض مقامات پر اکابرین و اسلاف امت اور خاص طور پر انھوں نے موالک، مع امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر جو کرم فرمائی کی ہے اسے پڑھ کر ازحد کوفت بھی اٹھانی پڑی۔ بعض مقامات پر تنقید کا پیمانہ اتنا سخت کر دیتے ہیں اور احادیث و آثار کے معاملے میں اتنی سطحیت پر اتر آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ ہے۔ علمی مباحث میں تو ان کا حال یہ ہے لیکن صاحب فتوحات مکیہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم گویا کہ سراپا نور ہیں اور اسی عالم میں آپ نے ابومحمد ابن حزم کو اپنے سینۂ مبارک سے چمٹا لیا ہے۔ پھر ایک جسم دوسرے جسم میں سمو گیا ہے حتیٰ کہ ایک ہی جسم رہ گیا ہے اور وہ صرف حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ پڑھ کر ان سے بُعد میں کمی واقع ہوئی۔ خدا ایسے بھلے انسانوں کا بیڑا پار لگائے مگر کاش کہ کچھ حفظ مراتب کا دھیان رکھتے۔

فرمایا خواجہ الطاف حسین حالی کی شادی پانی پت کے شیعہ سادات میں ہوئی۔ بی سلام النساء ان کی اہلیہ تھیں۔ بہت تیز مزاج اور پھر اس مزاج کے اظہار میں ذرا تامل نہ تھا۔ ایک مرتبہ قصہ یہ ہوا کہ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور

اپنے سالے فیاض حسین کے ساتھ پانی پت میں نویں محرم کوایک تانگہ لے کراپنے کسی کام سے گئے۔کوچوان نے تانگہ کچھ اس طرح سے چلایا کہ، الٹ گیا، تینوں افراد کو کچھ چوٹیں تو آئیں لیکن بچ گئے، گھر لوٹے تو بی سلام النساء کا غصہ اپنے عروج پہ تھا۔خوب برسیں اور شوہر، بیٹے اور بھائی کی قیامت برپا کردی کہ حضرت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نواسے پر تو قیامت کی گھڑی ہے۔ان کے اعزہ واقربا تو بھوک اور پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم تینوں کو تانگے پر سیر کی سوجھی ہے۔اچھا ہوا کہ تانگہ الٹا تمہیں سزا ہوئی، اور بہت کچھ کہا، بیٹے اور بھائی کو یہ رویہ بہت کھلا کہ جانے دو ہماری تو خیر ہے لیکن خواجہ صاحب شوہر ہیں۔ بلند پایہ آدمی ہیں، انھیں اس طرح سے مخاطب کرنا تو بالکل درست نہیں ہے لیکن خواجہ الطاف حسین حالی اس قدر ٹھنڈے مزاج کے تھے کہ بولے تو صرف یہ کہا کہ آج سیدانی جلال میں ہیں۔جو کچھ کہتی ہیں، حق ہے، آج کے دن سواری پر بیٹھے، ہماری ہی غلطی تھی۔

فرمایا سر سید احمد خان اور علامہ شبلی نعمانی کو خواجہ الطاف حسین حالی سے بہت محبت اور ان کے حال پر بڑی شفقت تھی۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب، حکومت نے خواجہ صاحب کو دیا۔اس اعزاز کی مبارک باد میں علامہ شبلی نعمانی نے انھیں ایک نہایت دلچسپ اور وقیع جملہ لکھا کہ مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔

فرمایا انگریز حکومت نے جن بے قصور لوگوں پر ظلم کیا ان میں ایک مرزا اسداللہ خان

غالب بھی تھے۔ چھ ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تو دہلی میں میاں کالے کی حویلی میں قیام ہوا۔ کسی نے دریافت کیا کہ جناب والا کا قیام آج کل کہاں ہے تو فرمایا ''پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں''۔

فرمایا

میر انیس مرثیہ نگاری کے بادشاہ تھے۔ لکھنؤ کیا برصغیر اور برصغیر کیا اب تو جہاں بھی اردو ادب کی رثائی شاعری کی بات ہوگی حضرت میر انیس سرفہرست ہوں گے۔ انھوں نے دل بہلانے کے لیے ایک خوبصورت بلی پالی تھی۔ بلی کیا تھی گویا کہ محبوبہ تھی۔ اس کی ناز برداریاں کرتے، قصاب کے ہاں سے اس کے لیے گوشت آتا۔ دسترخوان پر ان کے سامنے یا پہلو میں بلی کو نشست ملتی اور جب تک وہ نہ ہوتی حضرت میر انیس اپنے منہ میں لقمہ نہ ڈالتے مگر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ یہ بلی چوری ہوگئی۔ بلی کیا چوری ہوئی، حضرت میر انیس پر قیامت ڈھ گئی۔ کھانا پینا سب موقوف ہوگیا اور منتسبین کی پریشانی الگ، اسی اثنا میں، جبکہ میر انیس سو رہے تھے، دستک ہوئی، دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت میر دبیر کھڑے ہیں انھیں سوتے سے جگایا گیا نہایت گھبرائے ہوئے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ میر دبیر کھڑے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ میر انیس نے بڑھ کر معانقہ کیا اور گریے کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا بھوک ستا رہی ہے، کھانا کھلا دیجئے، میر انیس حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ میر دبیر لکھنؤ کے نامور شاعر اور آسودہ حال، کھانا تو ظاہر کی پردہ داری ہے، حقیقت میں معاملہ کچھ اور ہے۔ دسترخوان بچھایا اور کھانا چنا گیا۔ آداب دعوت

کے مطابق میر انیس بھی لقمے اٹھاتے رہے، میر دبیر گویا ہوئے اور فرمایا میری آنکھ لگ گئی تھی کہ آپ کے جدامجد تشریف لائے اور فرمایا کہ انیس نے آج کھانا نہیں کھایا، جا کر انھیں کھانا کھلائیں اور کہہ دیں کہ جو کچھ کھو گیا ہے سویرے مل جائے گا۔ چنانچہ اگلے دن سویرے بلی خود بخود واپس چلی آئی۔

فرمایا درس نظامی کی کتاب مطوّل، جسے اب مولوی نہیں پڑھتے، مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ نے اپنے اساتذہ سے پڑھی اور وہ نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے کتب خانے میں تھا۔ اس پر جہانگیر بادشاہ کے دستخط بھی تھے۔ یہ نسخہ اب علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہونا چاہیے۔

فرمایا اردو کا محاورہ ''ہنوز دلّی دور است'' اپنے پس منظر میں ایک حقیقت کا حامل ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو بعض وجوہ کی بناء پر حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے پرخاش تھی۔ بنگال کی ایک مہم کے بعد جب وہ دہلی لوٹ رہا تھا تو ایک تیز رو قاصد کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو پیغام بھجوایا کہ میرے دہلی میں داخل ہونے سے پہلے پہلے دلّی خالی کر دیں۔ دلّی میں اب یا تو آپ رہیں گے یا پھر میں رہوں گا دلّی نہ چھوڑنے کی صورت میں انجام اچھا نہ ہوگا۔ حضرت نوراللہ مرقدہ نے جب یہ پیغام سنا تو بے اختیار زبان الہام ترجمان سے یہ جملہ صادر ہوا ''ہنوز دلّی دور است''۔ سلطان غیاث الدین بنگال کی مہم سے کامیاب واپس آرہا تھا۔ پرغرور فاتح کے استقبال کے لیے ساری

دلّی سجائی گئی، ولی عہد بہادر نے دلّی سے صرف تین میل کے فاصلے پر ایک عارضی محل تعمیر کرایا کہ غازی بادشاہ یہاں اتریں۔ شہر میں داخل ہونے سے قبل کچھ ہلکا پھلکا کھانا کھائیں اور تازہ دم ہوکر سجے ہوئے محل میں داخل ہوں۔ سلطان اس محل میں داخل ہوا اور کھانا کھایا۔ دلّی کے امراء اور فقراء اس معرکے کو بھی سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ سلطان دنیا کا حکم ہے کہ اس کا دارالحکومت چھوڑ دیا جائے اور سلطان دین کسی قیمت پر دلّی چھوڑنے کو تیار نہیں صرف یہ فرماتے کہ ابھی دلی دور ہے۔ ایک کے پس پشت حشم وخدم ہے۔ سلطنت ہے، افواج اور سپاہ ہیں اور دوسرے کی کل کائنات ''یقین'' صرف تین میل کا فاصلہ۔ بادشاہ نے کھانا کھایا۔ تمام وزراء اور فوج کے سربراہ اپنی سواریوں پہ جا چڑھے، محل میں صرف پانچ افراد تھے اور بادشاہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اچانک آسمان سے بجلی گری۔ محل دھڑام سے گرا۔ بادشاہ اور اس کے پانچوں مصاحبین ایسی سلطنت میں جا پہنچے جہاں صرف اللہ کی بادشاہی ہے اور سب مخلوق بے اختیار۔ سلطان دین نے معرکہ جیت لیا۔ یقین نے مزعومہ وہم کو شکست دے دی اور عوام الناس میں وہاں سے یہ محاورہ چلا ''ہنوز دلّی دوراست''۔

فرمایا

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور حضرت جوش ملیح آبادی کا تعلق تقسیم کے بعد بھی استوار رہا۔ یہ جب بھی ہندوستان جاتے، مولانا کی خدمت میں ضرور حاضری ہوتی، ایک مرتبہ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ دنیا بھر کے لوگ اپنے سیاسی مسائل کے حل کے لیے میرے

پاس آتے ہیں، ادب کی دنیا پر کوئی بات نہیں ہوتی۔ آپ بھی تو تشریف لایا کیجیے۔ چنانچہ جناب کنور مہیند رسنگھ بیدی سحؔر اور حضرت جوش دونوں ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مولانا تو سیاسی حضرات کے جھرمٹ میں ہیں۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کے بعد جوش صاحب نے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا:

؎ نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

اور اس کے بعد یہ جا، وہ جا۔ ابھی گاڑی تک بھی نہ پہنچے تھے کہ مولانا کے سیکرٹری خان اجمل خان بھاگتے ہوئے آئے اور مولانا کی طرف سے معذرت کر کے واپس لے گئے۔ مولانا نے خود بھی معذرت کی اور بہت تپاک سے ملے۔

فرمایا پنڈت جواہر لال نہرو کو حضرت جوش سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بحیثیت وزیر اعظم انھوں نے کہا کہ جوش صاحب اگر چہ آپ نے اب پاکستان کی شہریت لے لی ہے لیکن اس کے باوجود آپ سال بھر میں صرف تین ماہ ہی ہندوستان آجایا کریں تو میں آپ کو پورے بارہ ماہ کی تنخواہ دلوادیا کروں گا۔

فرمایا جناب علامہ انور صابری مرحوم کا شمار پر گو شعراء میں ہوتا تھا اور کیمرے کا نیا نیا دور تھا اور علامہ مرحوم تصویر کھنچوانے سے گریزاں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو تصویر کشی شروع ہوگئی، علامہ صاحب نے بہت

مہذب انداز میں روکا اور فرمایا کہ بھئی میری تصویر لے کر کیا کروگے؟ شنکر پرشاد صاحب نے فوراً فقرہ چست کیا مولانا! بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گی۔

فرمایا بمبئی کے ایک مشاعرے میں حضرت جوش ملیح آبادی اپنی مشہور نظم، جس نے ایک عرصہ تک برصغیر کی ادبی مجالس میں تہلکہ مچائے رکھا ''گل بدنی'' اپنے مترنم لہجے میں پڑھ رہے تھے کہ کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ نے برجستہ داد دیتے ہوئے کہا کہ حضرات ملاحظہ ہو، پٹھان ہوکر اتنی اچھی نظم کہہ رہا ہے۔ حضرت جوش نے برجستہ جواب دیا کہ حضرات ملاحظہ ہوسکھ ہوکر اتنی اچھی داد دے رہا ہے۔

فرمایا دہلی کلاتھ ملز کے مالک سر شنکر لال شعروشاعری اور موسیقی کی دنیا کے آدمی تھے انسانی رویوں اور اخلاقیات کے بادشاہ تھے جس کسی نے ذرا سا بھی احسان کردیا، عمر بھر اسے نبھاتے رہے۔ دوسروں کا اتنا احترام اور ایسے وضع دار تھے کہ ایک مرتبہ اپنی گاڑی میں کنور مہیند رسنگھ بیدی سحرؔ کو اپنے گھر لے جارہے تھے اور ان کی گاڑی کے سامنے ایک اور گاڑی جارہی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے اپنی گاڑی بڑھانی چاہی تو فوراً منع کردیا اور فرمایا کہ اگرچہ راستہ صاف ہے، کوئی حادثے کا خوف نہیں ہے لیکن دیکھئے سامنے والی گاڑی رائے بہادر پرشاد کی ہے۔ یہ دہلی کے رئیس اعظم ہیں۔ ان کے بزرگوں نے میرے آباء واجداد پر احسانات کیے ہیں اس لیے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہماری گاڑی ان کی گاڑی سے آگے چلے۔ بذات خود پوتڑوں کے رئیس تھے لیکن بدرجہ اتم انسانیت تھی

درجنوں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت کرتے تھے۔

فرمایا پاکستان بننے کے بعد ''جنگ'' اخبار میں مزاحیہ کالم نگار جناب مجید لاہوری تھے ''حرف وحکایت'' اور ''نمکدان'' کے عنوان سے بہت عمدہ کالم چھپتے تھے۔ ''جنگ'' اخبار کی پرانی فائلز کو جب پڑھا تو بار ہا یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص ان کے ان کالموں کو جمع کر دے، تو اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہو جائے۔ خود ہی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، بتاتے تھے کہ اپنی جان اور جثّے کے اعتبار سے بھی جناب مجید لاہوری صاحب سراپا مزاح لگتے تھے۔ افسوس کہ عمر بہت کم پائی عمر صرف چالیس برس ہوئی۔ اور خود ہی اپنے ایک مصرعے میں کہا

؎ دوسرا مجھ سا کوئی لا نہ سکے گی دنیا

فرمایا لاہور میں پرانی سبزی منڈی کو جو راستہ چیمبر لین روڈ (Chamberlane Road) کی طرف جاتا ہے وہاں برلب سڑک ایک مزار ہے۔ یہ مزار بابا تاج شاہ مجذوب کا ہے۔ راجہ رنجیت سنگھ ان کے بہت معتقد تھے۔ یہ مغلوب الحال مجذوب اور صاحب کشف تھے اور کئی مرتبہ ایسی پیشن گوئیاں کرتے تھے جو اپنے وقت پر پوری ہوتی تھیں اور اس وجہ سے لوگ ان کے معتقد تھے۔ راجہ رنجیت سنگھ کی عقیدت کا باعث بھی یہی چیز تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مرض الموت میں انھیں بلایا اور صحت کی دعا چاہی تو انھوں نے کہا چندن منگائیں۔ چندن اصل میں صندل کی لکڑی کو کہتے ہیں۔ (Santalum

Album) یہ لکڑی مُردوں کو جلانے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اس کا شمار عمدہ قسم کی لکڑیوں میں ہوتا ہے اسی لیے یہ محاورہ بنا

چندن پڑا چمار کے نت اُٹھ کوٹے چام رورو چندن مہی پھرے پڑا نیچ سے کام

تو رنجیت سنگھ سمجھ گئے کہ یہ موت کا کنایہ ہے۔ پھر انھوں نے اسے کہہ بھی دیا کہ تیرے بعد یہ سلطنت سکھ صرف نو سال سنبھال سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ راجہ رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں نذر چندن ہوئے اور ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے تخت لاہور کو بھی اپنی سلطنت میں ضم کرلیا۔

فرمایا

حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بہت بیدار مغز بادشاہ تھے۔ عوام کو صرف دنیوی سہولتیں ہی فراہم نہیں کیں، اس پر بھی برابر نگاہ رکھی کہ ملک میں بدعقیدگی نہ پھیلنے پائے۔ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''تسویہ'' کے بعض مندرجات پر نہ صرف شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا بلکہ اسے خلاف شریعت سمجھتے ہوئے، جلانے کا حکم بھی دیا۔ ''تسویہ'' کی کئی شروح ان کے زمانے میں تحریر کی گئیں۔ اس کے مصنف حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ وحدۃ الوجود کے زبردست داعی تھے۔ انھوں نے حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی ''فصوص الحکم'' کی عربی اور فارسی شروح بھی لکھی ہیں اور ان کی باقی تصانیف میں بھی وحدۃ الوجود کی دعوت ہے۔ ''تسویہ'' میں بھی چونکہ یہی دعوت ہے اور

کچھ حد سے بڑھ گئی ہے اس لیے اس رسالے کے رد میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے حضرت خواجہ عبیداللہ نے بھی ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ اور پھر وہ وحدۃ الوجود کے داعی تھے اور یہ حضرات سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین، وحدۃ الشھود کے قائل۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بھی نقشبندی مجددی اور وحدۃ الشھود کے قائل اور انھی کا بھائی داراشکوہ وحدۃ الوجود کا غالی قائل اور حضرت محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک۔ یہ تمام عوامل واسباب جمع ہو گئے تھے چنانچہ اس دور میں وجود اور شہود کی بہت گراں قدر علمی مباحث بھی خوب ہوئیں۔ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار میں اتنے فنا تھے کہ اپنے دور میں ابن عربی ثانی کہلائے۔

فرمایا

خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر نواب رام پور نے حضرت داغ دہلوی کو باقاعدہ ملازمت عطا کر دی تھی۔ حضرت خلد آشیاں شعراء کو صرف شاعری ہی کی وجہ سے وظیفہ نہیں دیتے تھے بلکہ سلطنت کے کچھ کام بھی شاعر کے سپرد کر دیتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی دربار رام پور کے شاعر تو تھے، سو تھے، ان کے ذمے گاڑی خانہ، شتر خانہ وغیرہ بھی تھے۔ حضرت امیر مینائی کی دربار رام پور نے قدر افزائی کی وظیفہ مقرر کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفتی عدالت کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ منشی امیر اللہ تسلیم کی قدر دانی بھی رہی اور ناظر فوجداری بھی مقرر کیے گئے۔ حضرت خلد آشیاں نے ارادہ حج کیا اور ۱۸۷۲ء میں کوچ

ہوا۔حضرت داغ دہلوی نے اپنی مشہور زمانہ غزل اسی سفر میں کہی تھی۔

؎ لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دل بے مدعا دیا تو نے

فرمایا

حضرت داغ دہلوی نوعمری ہی میں قلعہ معلّیٰ دہلی کا رنگ دیکھ چکے تھے اور بوجہ صاحب کمال ہونے کے بے نیازی اس پر مستزاد، ایک مرتبہ محمود علی خان محمود رامپوری حاضر ہوئے تو یہ عصر کا وضو کررہے تھے۔مزاج ناگوار تھا محمود سے فرمایا کہ کاغذ لو اور میرا استعفٰی لکھ دو۔انھوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا آج حضرت نواب صاحب نے اصطبل کا ملاحظہ کیا اور مجھ سے فرمایا ’’گھوڑے دبلے ہوگئے ہیں‘‘۔اور یہاں ہزار کام سر میں ہیں۔مجھ سے ملازمت نہیں ہوسکتی۔محمود رامپوری نے کہا کہ استعفٰی تو میں لکھ دیتا ہوں لیکن اسے منظور کون کرے گا۔فرمایا کہ محمود جب مجھے ہی ملازمت منظور نہیں تو کیسے رکھیں گے۔ استعفٰی لکھا گیا اور بھجوایا گیا۔ جب پیش ہوا تو نواب رام پور حضرت کلب علی خان نے طلب کیا اور وجہ استعفٰی دریافت کی۔انھوں نے عذر پیش کیا کہ حضور ضعف بہت ہوگیا اس لیے ملازمت درست طریقے سے ہونہیں سکتی اور قرضے نے الگ پریشان کر رکھا ہے۔ حضرت نواب صاحب بہت خاموشی سے سنتے رہے اور جب ان کی بات پوری ہوگئی تو فرمایا: نواب میرزا آپ کو کون نوکر سمجھتا ہے۔میں تو اپنا بھائی کہتا ہوں۔اور ارادہ یہ ہے کہ میں اور تم ایک ہی قبر میں دفن ہوں اور تم ہو کہ مجھے چھوڑ رہے ہو۔پھر قرضے کی تفصیل

دریافت کی اور فرمایا کہ قرضہ چھوٹ جائے گا اور آج سے آپ کی تنخواہ میں پچاس روپے اضافہ کیا جارہا ہے۔ حضرت داغ دہلوی واپس ہوئے اور یہ تمام کتھا اپنے شاگرد محمود علی خان محمود رامپوری کو سنا کر فرمانے لگے کہ محمود اب تم ہی بتاؤ کہ یہ باتیں ایسی ہیں کہ کسی کو یہاں سے نکلنے دیں؟۔ حضرت داغ دہلوی کو نواب خلد آشیاں سے ایسی محبت اور تعلق خاطر تھا کہ شعر کہا ہے

ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغؔ
کس طرح جائے کلب علی خان کو چھوڑ کر

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغؔ
وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں کے ساتھ

فرمایا

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں اشبیلیہ گیا تو وہاں حضرت ابوعمران موسیٰ بن عمران مرتلی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ جو کہ اس دور کے اکابر اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ میں نے انھیں ایک کام کے سلسلے میں بہت اچھی خبر سنائی تو انھوں نے مجھے دعا دی کہ جیسے آپ نے مجھے خوشخبری دی، اللہ تعالیٰ ایسے ہی تمھیں جنت کی بشارت دے۔ وقت گذر گیا۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اپنے بعض وفات شدہ دوستوں کو خواب میں دیکھا تو ان کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے مجھے خیریت کی اطلاع دی

اور پھر بہت دیر گفتگو کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بشارت دی ہے کہ تم جنت میں میرے دوست ہوگے۔ تو میں نے اپنے اس دوست سے کہا کہ یہ تو خواب ہے جو میں دیکھ رہا ہوں اور خواب کوئی دلیل نہیں ہوتے مجھے ایسی دلیل بتاؤ جس سے مجھے اندازہ ہوجائے کہ یہ جو کچھ آپ نے کہا ہے، یہ سب سچ ہے۔ انھوں نے فرمایا کیوں نہیں! دیکھیے اس خواب اور میرے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کل نماز ظہر کے وقت حاکم وقت آپ کو طلب کرے گا تاکہ آپ کو قید میں ڈال دے، اس لیے اپنی حفاظت کرنا۔ یہ واقعہ اس خواب کے سچا ہونے کی دلیل ہوگا۔ جب میں سویرے سو کر اٹھا تو غور کرنے لگا کہ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ حاکم وقت مجھے قید میں ڈال دے گا؟ کوئی جرم سمجھ میں نہیں آیا لیکن جونہی ظہر کی نماز پڑھ کی فارغ ہوا تو سلطان کی طرف سے ہرکارے آئے اور میرا دریافت کرنے لگے۔ میں نے جان لیا کہ وہ خواب سچا ہے اور اپنے آپ کو پندرہ دن کے لیے روپوش کرلیا اور اسی اثنا میں میری طلبی بھی ختم ہوگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خواب سچ ہوتے ہیں ان کا اعتبار کرنا چاہیے۔